خواجہ حیدر علی آتش

(1847 — 1777)

آتش کا اصل وطن فیض آباد تھا۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا، جس کی بنا پر ان کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت نے انھیں جلد ہی نواب محمد تقی خاں ترقی کے دربار تک پہنچادیا۔ نواب ترقی کے ساتھ وہ لکھنؤ آگئے اور وہیں رہ گئے۔ ان کے مزاج میں ایک فقیرانہ انداز تھا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا۔ تقریباً تمام زندگی انھوں نے تنگی، ترشی کے ساتھ بلا کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے گزار دی۔ آخری عمر میں آتش کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس لیے وہ اپنے چھوٹے سے مکان میں بند ہوکر بیٹھ رہے۔ شاگردوں کا آنا جانا البتہ باقی تھا، اور شاعری ہی ان کی زندگی تھی۔ آتش کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔

آتش کے مزاج میں جو قلندرانہ شان تھی وہ ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کا لہجہ بلند آہنگ ہے۔ وہ چھوٹی سی بات کو بھی بڑی دھوم دھام سے کہتے ہیں۔ ان کے یہاں دنیا کے بارے میں ایک بلند ہمّت، بے پروائی ملتی ہے۔ یہ چیز دل کو متاثر کرتی ہے لیکن ان کے یہاں خیال یا جذبے کی کوئی خاص گہرائی نہیں، مگر سستے قسم کے

شاعروں کی طرح کا رونا بسورنا بھی نہیں ہے۔

آتش کے ساتھ ناسخ کا نام اکثر لیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں الگ الگ طرح کے شاعر ہیں۔ حالانکہ سچّی بات یہ ہے کہ دونوں کی شاعری میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ آتش اور ناسخ نے ایک دوسرے سے اثر بھی قبول کیا ہے۔ بعض حیثیتوں سے آتش کا مرتبہ ناسخ سے، بلند ہے لیکن بعض حیثیتوں سے ناسخ کا مرتبہ، آتش سے، برتر ٹھہرتا ہے، ناسخ کے یہاں نئی باتوں کی تلاش یعنی خیال بندی اور مضمون آفرینی بکثرت ہے۔ ان کے یہاں ہنسی مذاق کا بھی انداز ہے۔ آتش کے یہاں عشقیہ اور کبھی کبھی صوفیانہ معاملات، ناسخ کے مقابلے میں، بہت زیادہ بہتر طریقے سے نظم ہوئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس شاعری کو "لکھنؤ اسکول" کی شاعری کا نام دیا گیا ہے اُس کے بہترین نمونے آتش اور ناسخ کے یہاں ملتے ہیں۔

(1)

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں
حواس خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں

وہ آب و رنگ کہاں روئے یار کا گل پر
ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں

صدا یہ قبر سے بیدار دل کو آتی ہے
عمل جو نیک ہوں تو ایسی خواب گاہ نہیں

نہ پاک ہوگا کبھی حُسن و عشق کا جھگڑا
وہ قصّہ ہے یہ کہ جس کا کوئی گواہ نہیں

فقیر بن کے قدم مار اس میں اے آتش
طریقِ احمدِ مُرسَل سی شاہراہ نہیں

(2)

خوشا وہ دل کہ ہو جس میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بُو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سُنا ہے جاہے قریبِ رگِ گلو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

میری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری

جو ابر گریہ زناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری کسی میں خو تیری

زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

معنی اور اشارے

سپاہ = فوج، لشکر
بیدار دل = وہ دل جو خدا کی طرف متوجہ ہو۔
ایسی خواب گاہ نہیں = اس سے بڑھ کر کوئی سونے کی جگہ نہیں۔
طریق = راستہ، طریقہ
مُرسَل = بھیجا ہوا۔ چونکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق پیغمبر کو خُدا کی طرف سے دُنیا میں بھیجا جاتا ہے، اس لیے یہاں احمدِ مُرسَل کے معنی ہوئے : احمدؐ یعنی رسولِؐ اسلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔
شبِ فراق = جدائی کی رات
روزِ وصل = ملاقات کا دن، خاص کر معشوق سے مُلاقات کا دِن
تا دمِ صبح = صبح ہونے تک
خُو = عادت، خصلت

غور کرنے کی بات

غزل نمبر ایک، شعر نمبر تین : "بیدار دل" یا "دلِ بیدار" قرآن شریف میں ایسے دل کے لیے آیا ہے جو خدا کی طرف متوجّہ ہو۔ صوفیوں نے اس فقرے کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے یعنی وہ دل جس میں محبّت کا سوز ہو اور

یہ سوز خدا کی طرف متوجّہ ہونے سے پیدا ہوا ہو۔ اس شعر میں "بیدار دل" کے اعتبار سے "خواب گاہ" خوب ہے۔

شعر نمبر پانچ : "طریق" کے معنی "راستہ" بھی ہیں اور "طریقہ" بھی۔ دونوں معنی یہاں مناسب ہیں۔

غزل نمبر دو، شعر نمبر ایک : دماغ کے ایک معنی ناک بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استاد شاعر اکثر اس لفظ کے ساتھ کوئی ایسا لفظ بھی رکھتے ہیں جس میں خوشبو کی طرف اشارہ ہو۔

شعر نمبر دو میں قرآن شریف کی اُس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں خدا نے کہا ہے کہ میں تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں۔

شعر نمبر تین : "چراغ ہاتھ میں لے کر دن کی تلاش کرنا" بہت خوب ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ جب کسی چیز کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ اس کا ملنا ممکن نہیں تو یوں بھی کہتے ہیں کہ "چراغ لے کر ڈھونڈو پھر بھی نہ پاؤ گے۔"

مشق اور مطالعہ

(1) "طریق" کے معنی "راستہ" بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے شعر میں کیا خوبی پیدا ہو گئی ہے ؟

(2) غزل نمبر دو، شعر نمبر چار : اس بات کی وجہ بتائیے کہ پیراہن سے بُو نکل کر چلنے کی خبر صبا کے ذریعے کیوں بھیجی جا رہی ہے۔ "نکل چلی ہے" کا فقرہ کئی معنی رکھتا ہے۔ بتائیے وہ کیا کیا ہیں ؟

(3) غزل نمبر دو، شعر نمبر چھ : صوفیوں کی اصطلاح میں "سیف زباں"

اس کو کہتے ہیں جس کے مُنھ سے نکلنے والی بات پوری ہوجاتی ہے۔
چونکہ "سیف" کے معنی تلوار ہوتے ہیں، اس لیے یہاں "معرکہ" کے اعتبار سے "سیف زباں" بہت خوب ہے۔

(4) "قدم مارنا" بمعنی "چلنا" فارسی محاورہ "قدم زدن" کا ترجمہ ہے۔ اب تک جو غزلیں آپ نے پڑھی ہیں ان میں سے پانچ محاورے تلاش کیجیے جو فارسی کا ترجمہ ہوں۔

شیخ محمّد ابراہیم ذوقؔ

(1854 — 1789)

ذوقؔ دہلی کے رہنے والے تھے، یہیں پیدا ہوئے، یہیں مرے۔ وہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ ان کی باقاعدہ تعلیم تو زیادہ نہ ہوئی لیکن انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت کے ذریعے بہت لیاقت پیدا کرلی۔ ابتدا میں وہ شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے لیکن نوعمری میں ہی ان کی شاعری کا شہرہ پھیل گیا اور انھوں نے اپنی راہ الگ کرلی۔ اُنتیس برس کی عمر میں شاہی قلعے سے ان کا تعلّق قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفرؔ جب 1837 میں بادشاہ ہوئے تو انھوں نے ذوقؔ کو "مَلِک الشّعراء" اور "خاقانیِ ہند" کے خطابات دیے۔ پہلا خطاب تو اس وجہ سے تھا کہ ذوقؔ، شاعری میں بادشاہ کے استاد تھے اور اس زمانے کے بڑے شعرا میں تھے۔ دوسرا خطاب اس لیے تھا کہ ذوقؔ بلند پایہ قصیدہ نگار تھے اور ایران کے قصیدہ نگاروں میں خاقانیؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

ذوقؔ کی غزلوں میں خیالات و جذبات کی کوئی خاص پیچیدگی یا گہرائی نہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نئی بات بھی کہیں اور